Scanned by CamScanner

ٹام راج سے رام راج تک

AL-HAMRA ARTS COUNCIL LIBRARY
ACC No 299
LAHORE

سید رئیس احمد جعفری

لاہور اکیڈمی
۲۰۵ سرکلر روڈ — لاہور

Scanned by CamScanner

انتساب

شیخ بشیر احمد (کوئٹہ - صرافہ بازار) کے نام، جو پہلے مسٹر واسدیو تھے۔ لیکن آج سے تیس سال پہلے جنہوں نے اسلام کی حقانیت کے سامنے سر جھکایا اور اسی کے ہو رہے۔ خاندان چھوڑا، بھائی سے رشتہ منقطع ہوا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں نے بائیکاٹ کر دیا، طرح طرح کی اذیتیں دیں، تکلیفیں پہنچائی، لیکن اس مرد مومن کے ثبات و استقامت میں لغزش نہ آئی!

Scanned by CamScanner

فہرست

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

مولانا فضل حق خیرآبادی کی حویلی

مولانا فضل حق خیرآبادی یگانہ خصوصیات و ملکات اور فضائل و حسنات کے جامع تھے، وہ عربی زبان کے بلند پایہ اور صاحبِ طرز انشا پرداز و شاعر تھے، منطق و فلسفہ کے امام تھے، دولت و ثروت اُن کے قدم چومتی تھی، شہرت پیچھے پیچھے چلتی تھی، وہ صاحبِ دل بھی تھے اور صاحبِ دماغ بھی، اہلِ قلم بھی اور اہلِ سیف بھی۔ اعزاز اور منصب کو اُن کی ذات پر فخر تھا، دولت و امارت اُن کے گھر کی لونڈی تھی بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ اختر کے عہد گرامی میں وہ دربار اور ایوان کی زینت بھی بنے لیکن علم و فن سے انہیں جو لگاؤ تھا وہ بدستور قائم رہا، ان کی اصل جگہ ایوانِ حکومت میں نہ تھی، مجلسِ علم میں تھی، اُن کے پایہ فضل و کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کی لکھی ہوئی کتابیں مدارسِ عربیہ کے نصاب میں گزشتہ ایک سو برس سے شامل ہیں، جن کی قدر و قیمت اور افادیت و معنویت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔

مولانا فضل حق کا وطن مالوف اودھ کا ایک مردم خیز قصبہ خیرآباد تھا۔ خیرآباد

جس کی زمین سے مرتبہ پست آسماں کا ہے!

یہ چھوٹی سی بستی علماء، صلحاء، اصفیاء، و صوفیاء، شعراء و ادباء، فضلائے روزگار اور حکمائے ذی وقار کا مولد و منشا رہی ہے۔ مولانا فضل حق بھی اسی دوران کے لعل شب چراغ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی عام طور پر غدر کے نام سے مشہور ہے لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ

Scanned by CamScanner

کچھ اور ہوتی اس تحریک میں مولانا نے بھی حصہ لیا، ماخوذ ہوئے اور حاکم مجاز کے سامنے پیش ہوئے۔ بچاؤ کی بہت سی صورتیں تھیں، وسائل و ذرائع بھی تھے، سعی و سفارش کے امکانات بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس انگریز کی عدالت میں مقدمہ پیش تھا وہ مولانا کی شخصیت سے بے حد متاثر تھا اور اس پر تیار تھا کہ اگر مولانا جرم سے انکار کر دیں تو وہ کاغذات داخل دفتر کر کے پروانہ رہائی صادر کر دے گا، لیکن مولانا اس پر تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے فرمایا، رہائی حاصل کر کے توشۂ آخرت سے محروم ہونا مجھے گوارا نہیں، اس جواب کے بعد رہائی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ساری املاک و جائداد ضبط کر لی گئی اور حبس دوام بعبور دریائے شور کے لئے فرمان صادر ہو گیا، مولانا زنداں بھیج دیئے گئے۔ املاک و جائداد سرکاری تحویل میں آگئی۔ زنداں کے دور اسیری ہی میں مولانا کے خامہ حقیقت رقم سے اَلثَّورَۃُ الہِندِیَّہ کے نام سے وہ موتی ٹپکے جو عربی ادب انشا کی تاریخ میں زندہ جاوید بن چکے ہیں۔

خیر آباد میں مولانا نے ایک نہایت شاندار اور رفیع المنزلت حویلی تعمیر کرائی تھی یہ سنگ سرخ کی ایک مستحکم اور خوش نما عمارت تھی جو رعنائی تعمیر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی، بہت بڑا پھاٹک — جن میں سے بیک وقت دو ہاتھی گزر سکتے تھے۔ — آگے بڑھیے تو ایک وسیع دالان بیچ میں ایک خوبصورت فوارہ دائیں بائیں خوشنما برآمدے سنگ مرمر کی ایک نہایت سبک اور نظر فریب بارہ دری۔ ان مرحلوں کو طے کر کے آگے بڑھیے تو زنان خانہ اپنی وسعت اور کشادگی میں ایک چھوٹا سا محل، پھر پائیں باغ۔ اس حویلی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی امیر کبیر کا کوشک ہے اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ مولانا جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں تجارت و کاروبار سے بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ سر سید نے آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں ایسے والہانہ طرز پر مولانا کا ذکر کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جہانگیر کے دربار میں عرفی اپنا

قصیدہ پڑھ رہا ہے۔

مولانا کی حویلی جس محلہ میں واقع تھی یہ ارباب شریعت اور اصحاب طریقت کا مسکن تھا۔ چند قدم کے فاصلہ پر حضرت بڑے مخدوم صاحب کا مزار پُرانوار ہے حویلی سے کھارے کنوئیں کی طرف بڑھیے تو ذرا سی مسافت پر عہد آخر کے صوفی صافی مقبول میاں کا آستانہ ہے۔

میں نے شعور کی آنکھیں کھول لینے کے بعد جب حویلی دیکھی تو اُس کی حیثیت ایک ویرانہ سے زیادہ نہ تھی۔ ضبطی کے بعد حکومت نے صلہ وفا کے طور پر اسے ایک غیر مسلم تعلقدار راجہ صاحب کمال پور — آزادی ہند کے بعد کمال پور کملا پور بن گیا ہے — کو بخش دیا۔

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس حویلی میں واقعی سمرقند و بخارا کا علم آکر جمع ہو گیا تھا۔

یہ حویلی جو آج ایک ویرانہ نظر آ رہی تھی کبھی علم و فضل کا مرکز تھی، یہاں سے علم کے سوتے پھوٹتے تھے۔ یہاں علم کی روشنی سے تاریکی نور بن جاتی تھی۔ دور دور سے مختلف دیار و امصار سے تشنگان علم آتے تھے اور سیراب ہو کر جاتے تھے یہ حویلی نہ تھی علم کا سرچشمہ تھا اور

ہر کجا بود چشمۂ شیریں

مردم و مرغ و مور گرد آیند!

اور اب یہ حویلی ایک ہندو تعلقدار کی ملکیت تھی، جسے اُس کے رکھ رکھاؤ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جس کے نزدیک یہ صرف خاک کا ایک ڈھیر تھی، جس کے پتھر قیمتی تھے لیکن ان پتھروں سے بھی پائندہ تر نقوش جو قدم قدم پر بکھرے ہوئے تھے، کوئی قیمت نہ رکھتے تھے، کسی اہمیت کے حامل نہ تھے۔ کبھی یہاں روم و شام، شیراز و

اصفہان ماوراءالنہر اور ترکستان کے طالبان علم جوق درجوق موج در موج آیا کرتے تھے۔ یہاں کے بام و در حکمت و معرفت کی صداؤں سے گونجا کرتے تھے۔ یہ صحن چمن گل کدہ نہ تھا، جنابان علم و فن تھا۔ یہ بارہ دری، یہ برآمدے، یہ کمرے، یہ ایوان، یہ دالان در دالان یہ صحنچیاں، یہ ڈیرے، جہاں اصحاب فضل و کمال کے قافلے اترا کرتے تھے جہاں ارباب فوج جرسر کے بل حاضر ہوتے تھے، جہاں وقت کے امرا اور حکام سر جھکا کر آستاں بوسی کیا کرتے تھے، جہاں علم کا دربار لگتا تھا، حکمت کی گرہ کشائیاں ہوتی تھیں، اجتہاد و تحقیق کے مرحلے طے ہوتے تھے۔ اب وہاں ویرانی تھی، سناٹا تھا، سکوت مرگ تھا۔ باغی کالے پانی بھیج دیا گیا اور وہیں عالم قید میں سفر آخرت کر گیا، اس کی اولاد اِدھر اُدھر بکھر گئی اور اس کا مکان عالی شان ویرانہ بن گیا۔

گلشن میں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

پھر کمال پور کے راجہ سورج بخش سنگھ کو اپنے محل کی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تعلقدار ہونے کے باوجود آدمی جزرس تھے بے ساختہ ان کی نظر مولانا کی حویلی پر گئی اس حویلی کے پتھر، یہاں کی لکڑیاں کاغذی اینٹیں اب بھی کام آسکتی تھیں اور یہ سب چیزیں انہیں کی تھیں کیونکہ ان کے رجواڑے کو حکومت نے جو چیزیں انعام کے طور پر عطا فرمائی تھیں اُن میں یہ حویلی بھی تھی۔

فوراً فرمان صادر ہوا اور مولانا فضل حق کی حویلی کدالوں اور پھاوڑوں کی زد میں آگئی یہ چھت اتری وہ دیوار گری یہ پھاٹک اُکھڑا۔

ایک محل ڈھے گیا۔

دوسرا محل تعمیر ہو گیا۔

مسلمانوں نے بےحسی طاری تھی، کسی نے صدائے احتجاج بھی بلند نہ کی ورنہ آسانی

سے یہ مسئلہ صوبائی کونسل میں اُٹھایا جا سکتا تھا اور محکمہ آثارِ قدیمہ مجبور کیا جا سکتا تھا کہ اپنی تحویل میں لے کر اُس کی نگہبانی کا فریضہ انجام دے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں آخری مرتبہ میرا خیرآباد جانا ہوا اُس وقت تک اُس حویلی کے کچھ کچھ آثار اور نقوش باقی تھے۔ کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ یہ ویرانہ کبھی رشکِ چمن رہ چکا تھا۔ مٹی مٹی سی سہی ایک یادگار باقی تھی لیکن زمانہ کی گردش اسے بھی نہ دیکھ سکی۔ اب وہ اکھڑے کھڑے اور مٹے مٹے سے نشان بھی باقی نہیں رہ گئے تھے۔

نومبر ۱۹۶۰ء میں ایک مرتبہ پھر خیرآباد جانے کا جی چاہا۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد کے لیے ایک ایک ہفتہ رکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق سب سے آخر میں خیرآباد کا نمبر آیا۔ لکھنؤ سے صبح نو بجے روانہ ہوا گیارہ بجے پہنچ گیا۔ اپنے عزیز اور دوست سید نجم الحسن صاحب کے یہاں مہمان بنا، تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر اپنے خاندانی قبرستان (حظیرہ میں) فاتحہ پڑھنے گیا وہاں سے مولانا فضل حق کی حویلی کی طرف گیا لیکن اب وہاں خاک اڑ رہی تھی جیسے صدیوں سے یہ مقام دشت و بیابان کا ایک حصہ چلا آ رہا ہے۔ سامنے حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ کا گنبد نظر آ رہا تھا۔ وہیں سے کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ کر واپس چلا آیا۔ طبیعت اتنی بے کل ہوئی کہ پھر ایک لمحہ بھی ٹھہرنے کا جی نہ چاہا۔ افتاں خیزاں اسٹیشن پہنچا اور لکھنؤ واپس آ گیا۔ چھوٹے ویرانے سے ایک بڑے ویرانے میں! ہا! یہ ہے دنیا!

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے